سفر پارے
حیدرآباد بک ڈپو

سفرپارے

اسیم

حیدرآباد بک ڈپو
۱۹۴۴ء

تمہید

کئی سال ہوئے ایک یادداشت کے طور پر میں نے مختلف سفر کے مشاہدوں کو قلم بند کر لیا تھا اور اب اس امید میں ان کو شایع کر رہا ہوں کہ وہ شاید بعض لوگوں کی تفریحی مطالعہ کی مستحق ہوں یا ان لوگوں کے لئے کام کی باتیں ثابت ہوں جنہیں ادبیات اور تمدن سے دلچسپی، سماج سدھار سے لگاؤ یا رفاہی کاموں میں دخل ہے۔

یہ سفر پارے کسی کے کام کے ثابت ہوں یا نہ ہوں، ان سے کسی کو دلچسپی ہو یا نہ ہو، اس کا امکان ضرور ہے کہ غلط تاویلوں سے یا عام باتوں کو خاص افراد سے منسوب کرنے سے رنجشیں اور شکایتیں پیدا ہوں مگر جب انسان کی نیت اجتماعی سدھار ہو تو اسے غرض مندوں کے عتاب اور نادانوں کی مخالفت بلکہ اتہام بازی کے لئے تیار ہونا چاہئے۔

کھرا کھوٹا پرکھنے کے لئے جب بعض سنہری تحریریں تنقید کی آگ میں ڈالی گئی تھیں، اس وقت سے میں ان مخالفتوں کا کچھ کچھ عادی بھی ہو گیا ہوں اور اب بھی میرا خیال ہے کہ رائے عامہ کو خاطر خواہ طور پر تشکیل دینے کے لئے علمی کتابوں اور تحقیقی مقالوں سے زیادہ عام فہم، مزاحی، طنزیہ یا دلچسپ تحریریں ضروری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے صداقت کے پس منظر کے ساتھ بعض اصلاح طلب امور کو شاید کسی قدر دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ کم سے کم میری کوشش یہی تھی۔

نسیم

سفر پارے

سفر کی چند یادگار باتیں

یا

سماج و سیاست معیشت و زبان

پر

تشریحی و تنقیدی تبصرہ

از

اسیم

حیدرآباد بک ڈپو

اسٹیٹ بنک روڈ
حیدرآباد دکن

قیمت
۱۵/

عہد آفریں برقی پریس
حیدرآباد دکن

فہرست

صفحہ

سفر پارے

سفر کی یادگار باتیں

تاج محل اور اُردو

سب سے زیادہ جس چیز سے مجھے حیرت ہوئی شمالی ہند کی مغرب زدگی اور
انگریزیت پسندی ہے چنانچہ خاص دوآبے میں جو نہ صرف ہندستانی تہذیب و تمدن
کا گہوارہ بلکہ اردو کا وطن ہے اور کئی ہندستانی زبانوں اور
تمدنی تحریکوں کا سرچشمہ ہے، معمولی معمولی لوگ بلا وجہ انگریزی
لفظوں کا استعمال کر کے اپنی مغرب زدگی کا ثبوت دیتے ہیں خیال

تھا کہ ادھر دس بارہ برس سے ہندستانی زبانوں کا عروج ہو رہا ہے کئی صوبوں میں کانگریسی حکومت قائم ہو گئی ہے ممکن ہے کہ حالات کچھ بہتر ہو گئے ہوں، لوگوں کی معاشی اور مالی حالت کے ساتھ یہ خیال تھا کہ شاید زبان بھی سنبھل گئی ہو مگر یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ تمدنی اور زبانی نقطۂ نظر سے ہم میں احساس کمتری کے مٹنے کے آثار پائے جاتے ہیں اور ہم اس خبط کی وجہ سے اپنی ذاتی تذلیل کر رہے ہیں آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتیں لکھ رہا ہوں، اور میرا مقصد اظہار حقیقت اور دعوت اصلاح ہے نہ کہ دل آزاری یا وعظ پسندی۔

"تاج محل" کے ایک موروثی خادم کو میں نے کسی دوسرے شخص کو کہتے سنا کہ

"وہ اس ٹری کے پرے ہے"

ٹری ؟؟؟ عجیب !! یہ کیا ؟؟ ...... درخت !!

جس ملک کے چھوٹے بڑے سب اسی خبط میں مبتلا ہوں کہ بے وجہ انگریزی لفظوں کا استعمال کر کے اپنی ادھوری تعلیم کا اظہار کریں تو پھر ان کم سمجھ اَن پڑھوں کا کیا قصور اگر انہوں نے بھی اپنی قابلیت جتانے کے لئے ۱۰۰ انگریزی لفظ سیکھ رکھے ہوں ؟

خاں بہادری اردو

ایک "خاں بہادر" کے ہاں مہمان تھا۔ ان کے ایک ملاقاتی سوٹ بوٹ میں گلوری چباتے ہوئے موٹر سے اترے رسمی طور پر میرا بھی تعارف کرایا گیا ان میں باتیں ہونے لگیں ایک خاموش سننے والے کی حیثیت سے مجبوراً بیٹھا رہا۔ گھر کی بیماری اور عدم فرصت کا ذکر ہوا۔ ایک نے کہا:

"میری وائف کو ان دنوں بہت کام تھا اور وہ آپ کے ہاں ملنے نہ آسکیں"

جواب ملا:۔

"میری وائف کو بھی ملنے کا بہت اشتیاق ہے نہ جانے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف دکن کے مغرب زدہ خطبنیوں کا شیوہ ہے کہ بیوی کو بیوی کہتے انہیں شرم آتی ہے۔ وائف کہتے شرم نہیں آتی مگر اب معلوم ہوا کہ وندھیاچل کے پرے بھی مغربیت کا اندھا جنون روزمرہ کی گفتگو کو غارت کر رہا ہے۔

رعایا اور درختوں کی ہم نصیبی

ضلع فرخ آباد پہنچا۔ رات ہو گئی تھی۔

وہاں کے کئی چھوٹے بڑے زمینداروں کا حال معلوم ہوا - دو ایک سے ملاقات بھی ہوئی - بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں موٹر نشین ہیں کثرتِ غذا تو ندبن کر سڈول پن اور صحت کو غارت کر رہی ہے، بڑھیا سگریٹ یا سگار پیتے ہیں، اور یہ گلے کرتے ہیں کہ کانگریسی حکومت کی وجہ سے زمینداریاں تباہ ہو گئی ہیں، گانوں سے مطلق آمدنی وصول نہیں ہوتی، سب گھرانے برباد ہو گئے ہیں - اگر تباہی اور بربادی کے معنی موٹر نشینی، سینما بینی، سگار نوشی اور مفت خوری ہے تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ کاش ایسی تباہی اور "بربادی" سب کو نصیب ہو! سچ تو یہ ہے کہ ہاتھی کتنا بھی ڈھلے پھر بھی لاکھ ہی کا رہتا ہی ہے! استحصال کرنے والوں پر کتنی ہی پابندیاں لگائی جائیں، نوچ کھسوٹ کے لئے انہیں موقعے ملتے ہی ہیں - چدم برم یونیورسٹی کی سرپرستی میں کل ہند معاشی کانفرنس ہو رہی تھی - زمینداروں کے ناجائز، خلاف قانون اور جابرانہ استحصال کا ذکر تھا، الہ آباد یونیورسٹی کے امریکی پروفیسر معاشیات نے جو سالہا سال سے اس عہدے پر فائز تھے اور اودھ کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے دلیرانہ طریقہ پر صاف صاف کہا تھا کہ "زمینداروں میں ایک عام دستور ہے کہ جب زمیندار کے گھر کے کسی فرد کی شادی ہوتی ہے تو علاوہ معمولی محصولوں کے ایک خصوصی محصول وصول کرتے ہیں جسے "شادیانہ"

کہتے ہیں، جب زمیندار کسی بڑے عہدہ دار خصوصاً لاٹ صاحب
کو مدعو کرتا ہے تو ان غریب کسانوں اور گانو والوں سے
ایک اور خصوصی محصول لیا جاتا ہے جسے "دعوتانہ" کہتے ہیں اور
چند سالوں سے یہ دستور ہو گیا جارہا ہے کہ جب زمیندار صاحب کو
ایک نئی موٹر کی "ضرورت" ہوتی ہے تو پھر ایک خصوصی محصول
عائد کرتے ہیں جسے مقامی اصطلاح کی بموجب ـــ موٹرانہ کہتے
ہیں"۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں مقررہ محصولوں کے علاوہ یہ گوناگوں خصوصی
محصول ادا کرتے کرتے ان غریبوں کی کیا حالت ہو جاتی ہو گی۔
ممکن ہے کہ فاضل پروفیسر کے اصل الفاظ کچھ اور ہوں مگر ان کا
مطلب یہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔ روئداد موجود نہیں ورنہ
حوالہ دیتا۔ ہماری "علمی" انجمنیں بھی روئداد نویسی کے فن سے
اچھی طرح واقف ہیں۔ لوگ جہاں تک ہو سکے کوئی ایسی بات
نہیں لکھتے جو گورمنٹ یا مالدار حلقوں کے خلاف ہو۔ خیال تو کیجئے
کہ جس "علمی روئداد" میں یہ لکھا ہے کہ لاٹ صاحب کس وقت
تشریف لائے ان کا استقبال کیونکر کیا گیا وغیرہ اس میں اس
محصول کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بہر حال مجھے تو ایسی کئی موٹریں نظر آئیں
جن کے متعلق شبہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ "موٹرانوں" کی بدولت
خریدی گئی ہیں۔ صبح جب اس ضلع کی مختلف سمتوں میں گھومنے
کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ بیشمار درختوں سے طفیلی بیلیں

(PARASITES) لپٹی ہوئی ہیں' میلوں چلے جائیے۔ جدھر چاہیے دیکھئے، تمام چھوٹے بڑے درخت ان بے جڑ کی بیلوں سے پٹے پڑے ہیں۔ شاید ہی کوئی درخت ہو جو ان طفیلی بیلوں سے لدا ہوا نہ ہو۔ وہاں کی سماج، معیشت اور نباتات کی ہم نصیبی کیونکر مشاہدہ سے بچتی؟ میں نے دیکھا کہ وہاں کی آبادی کی طرح وہاں کے درختوں سے بھی فالتو ہستیاں لپٹی ہوئی ہیں، خود غذا حاصل نہیں کرتیں دوسروں کا رس چوس رہی ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ آپ بھی جائیں تو خود مشاہدہ کریں کہ ہزاروں درخت ان ناہنجار بیلوں کی وجہ سے نیم جان ہوئے جا رہے ہیں۔

ریلوں کی اردو

ہماری بدترین کمزوریوں میں ہماری غفلت، لاپروائی، پست ذہنیت اور احساس کمتری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غیروں کے ہاتھوں اپنی تہذیب اور زبان کی بربادی گوارا کر رہے ہیں۔ اس بربادی کے اتنے ثبوت دیکھتے ہوئے یہ تعین کرنا مشکل تھا کہ تباہی کی یہ نشانیاں دوآبے میں نظر آ رہی ہیں اور اس تباہ کاری کو وہی "اہل زبان" گوارا کر رہے ہیں جن کی زبان شستہ اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

اگرچہ مجھے بھی علم ہے کہ ریلوں پر ہمارا زور نہیں، آئینی اعتبار

سے ریلوے کے کاروبار میں ہمارا عمل دخل نہیں، مگر یہ بھی میں جانتا ہوں کہ ریلوے بورڈوں میں جتنے ہندستانی افراد ہیں، چاہے وہ حکومت کے نمائندہ ہوں یا تجارتی اداروں کی طرف سے نمایندگی کر رہے ہوں، اگر وہ متحدہ طور پر ہندستانی زبانوں کی تحقیر کی مخالفت کریں تو اس خرابی کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے۔

مجھے خیال تھا کہ کانگریسی راج قائم ہونے کے بعد تحریری زبان سنبھل جائے گی، سرکاری محکمے زبان کی فصاحت اور پاکیزگی نہ سہی صحت کا خیال ضرور کریں گے مگر نہیں وہی پرانا ڈھرا قائم تھا۔ پرانی بدتمیزیاں موجود تھیں۔ پرانی زبان گشتی جاری تھی۔ بعض گاڑیوں کے نئے نئے ڈبوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہر چیز کی ظاہرا حالت سے پتہ چلتا تھا کہ ابھی ابھی یہ ڈبے بنے ہیں، ہر چیز نئی تھی جا بجا ضروری اعلانوں کی تحریریں بھی نئی تھیں صرف —— زبان پرانی تھی اور وہی زبان جو صاحب بہادر استعمال کرتے ہیں چنانچہ ایک اعلان تھا کہ:-

"مسافروں کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے کہ جب گاڑی چلتی رہے تب گاڑی کے دروازہ کو نہ کھول رکھیں یا اپنے جسم کے کسی حصہ کو کھڑکی یا دروازے کے باہر نہ رکھیں کیونکہ یہ دونوں عادتیں خطرناک ہیں۔"

خط کشیدہ لفظوں پر غور کیجئے۔ اس سے زیادہ مہمل عبارت

اور کیا ہو سکے گی؟ وہ بھی اس ریلوے کی جو اردو اور ہندی کے گہواروں میں ڈولتی ہے، اردو کے سرچشموں سے سیراب ہو رہی ہے، دوآبہ کی دولت سے مالا مال ہو رہی اور سچ مچ دہلی کی زبانی ٹکسال لال قلعہ میں سے گذرتی ہے۔

شاید آپ کو معلوم نہ ہو یا معلوم بھی ہو تو بھول گئے ہوں کہ دہلی سے غازی آباد کو جو ریل جاتی ہے وہ شاہان دہلی کی قیام گاہ اکبر کے بنائے ہوئے قلعہ اور بہادر شاہ ظفر کی آماجگاہ میں سے گذرتی ہوئی جاتی ہے اور اس ریل کی تعمیر کے وقت محض سہولت اور کفایت کی خاطر لال قلعے کی دیواروں کو توڑ تاڑ کے برابر کیا گیا اور رہتی دنیا کے سامنے اپنی بربریت اور غارت پسندی کا ثبوت دیا گیا۔ غرض لال قلعہ ٹوٹا، اس میں سے ریل گذری انگریزی مطلق العنانی کا بھی خاتمہ ہوا مگر ریلوں کی زبان نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی! کیا کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ اس قسم کے مہمل جملے کا کہ

"اپنے جسم کے کسی حصّہ کو باہر نہ رکھیں"

کیا مطلب ہے؟ اس قسم کے بے معنی اور لغو اعلانوں کا کیا فائدہ؟ کیا اردو کے شیدائی، ہندی کے پریمی، ہندستانی کے دلدادہ باقی نہیں ہیں کہ ریلوں کی زبان کُشی کے خلاف جہاد کریں اور ان کے دماغ کو ٹھکانے لگائیں؟؟ اگر خود حکومت کو

صحیح زبان کا احساس نہیں تو ریلوے کے ممبر، ریلوے بورڈوں کے ارکان، مجلس مقننہ کے اردو نواز اصحاب کیا کر رہے ہیں؟ یہ ایک ہی اعلان نہیں جسے نظر انداز کیا جاتا۔ اس قسم کے ہزاروں اعلان انگریزی ٹیپ خانوں، تار گھروں، سرکاری دفتروں اور ریل کے ڈبوں میں نظر آتے ہیں تعجب ہے کہ اردو کی ستیاناسی اسی صوبے میں کی جائے جو اردو کا وطن ہو اور —— اہل زبان خاموش بیٹھے رہیں؟! الہ آباد میں "ہندستانی اکیڈمی" اعظم گڑھ میں "دارالمصنفین"، قیصر باغ میں "اردو اکادمی" پریاگ میں "ہندی ساہتیہ سمیلن" ہو "ناگری پرچارنی سبھا" کا مسکن بنارس ہو اور انجمن ترقی اردو کا صدر مرکز دہلی میں ہو پھر بھی اس صوبے میں زبان کی توہین آمیز اور حقارت انگیز عبارتیں گوارا کی جائیں!! ایک طرف تو سرکاری اور قومی یونیورسٹیوں اور کالجوں، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں، مکتبوں اور درس گاہوں میں صحیح زبان سکھانے کی کوشش جاری ہے، اردو کے استادوں اور اردو کے پروفیسروں پر ملک و قوم کا روپیہ صرف ہو رہا ہے اور دوسری طرف سرکار کے محکموں میں، سرکار کی ریلوں میں اردو کی ناقدری ہی نہیں اردو کی ستیاناسی اور رغارت گری ہو رہی ہے اور ہم آپ خاموش بیٹھے تسفہ نگھار رہے ہیں۔

مسلمان اور اسراف

شمال ہو یا جنوب، مغرب ہو یا مشرق ہندستان کی کسی سمت
میں چلے جائیے آپ کو مسلمانوں کی یہ عام خصوصیت نظر آئے گی کہ
وہ کماتے کم ہیں لٹاتے زیادہ ہیں، تعمیری کاموں، قومی اداروں
اور رفاہی چیزوں پر کچھ توجہ نہیں کرتے، عیش و راحت نمود
اور نمائش پر سب کچھ لٹانے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ
مالدار ہیں، کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، عہدہ دار
ہیں، وہی سب سے زیادہ تن آسانیوں میں مبتلا اور عیش پسندیوں
کا شکار ہیں۔ جو کچھ دھن دولت، جائداد، نقدی بعض افراد بچاتے
ہیں وہ نہ تو خود کسی تعمیری اور اصلاحی کام پر صرف کرتے ہیں
اور نہ اولاد کو اس کی توفیق ہوتی ہے نتیجہ یہ کہ محتاط باپ کے
مرنے پر عیش پسند وارث انتہائی بے جگری سے پیسہ لٹا دیتے
ہیں۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے بزرگوں نے کس
جگر خراشی سے پیسہ جمع کیا تھا غرض بجز مستثنیات کے روپیوں
کی قسمت میں لٹنا ہوتا ہے اور وہ لٹائے جاتے ہیں اب
یہ کون پوچھے کس سے کہے؟ اور کہے بھی تو مانتا کون ہے کہ
مسلمانوں کا روپیہ اگر لٹنے ہی کے لئے ہے تو وہی کیوں نہ لٹائیں
جنہوں نے پسینہ بہا کر خود کمایا تھا؟

نہایت معتبر ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ ایک صاحب اپنے بیٹے کی تکمیل تعلیم کے لئے آٹھ ہزار چھوڑ گئے تھے: ان کے انتقال کے چند سال بعد اس رقم کو خاندان والوں نے ... شادی کی دھوم دھام پر لٹا دیا! وسط اودھ کے ایک چھوٹے شہر میں شادی ہو رہی تھی جس میں میں بھی شریک تھا۔ آس پاس کے شہروں سے دو تین طائفوں اور مراسنوں کے علاوہ خاص طور پر لکھنو کی ایک گانے والی کو چار یا پانچ سو روپیہ اور آنے جانے کا کرایہ دے کر بلایا گیا تھا۔ شادی عزیزوں میں ہوئی تھی دولہ دلہن بھی رشتہ دار تھے۔ سارے خاندان کو مرحوم کی وصیت کا علم اور محفوظ رقم کی غرض سے واقفیت تھی۔ پھر بھی حسب معمول گوناگوں اور پیچ در پیچ تاویلیں کر کے مرحوم کی رقم میں خیانت کی گئی، سارا پیسہ بارات اور استقبال کھانے اور عصرانے، ناچ گانے اور باجے گاجے پر لٹا دیا۔ کسی انجمن کو، کسی کار خیر میں، کسی مستحق ادارے کے لئے ایک روپیہ بھی نہیں دیا گیا اور اسی طوائف کو "سہرہ" گانے کے نیگ میں مقررہ معاوضہ کے علاوہ (صہ) دے ڈالے۔

اسی وقت ایک صاحب نے دبی آواز میں کہا "مال مفت دل بے رحم"! سننے والوں نے سنا اور سب کو مرحوم کی وصیت یاد آئی۔ ایک صاحب کہنے لگے:۔ "دیکھا آپ نے!

یہ ہے مسلمانوں کو اپنی ضرورتوں کا احساس! اس طرح مرحوم عزیزوں کی وصیتوں اور ارادوں کا لحاظ کیا جاتا ہے اور اس طرح کارِ خیر کی مد سے روپیہ نکال کر نمود پرستیوں اور ظاہر داریوں پر لٹایا جاتا ہے! اور لطف یہ کہ لڑکا بی اے اس کے خسر بی اے اور اس کے سالے صاحب بی اے! پھر بھی یہی لوگ اصرار کر کے روپیہ لٹا رہے ہیں! یہی ہے وہ تعلیم جس کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ "ایں عقل و دانش بباید گریست"! وہ اور بھی کچھ کہہ رہے تھے مگر میں انجان بن گیا بحث کا موقع نہ تھا ورنہ میں اعتراف کرتا کہ تعلیم نہ تو عقل کی ضامن ہے نہ عمدہ کردار اور سیرت کی! غرض تعلیم کے لئے محفوظ کردہ رقم میں سے ایک عصمت فروش کو تو پانچ چھ سو مل گئے مگر کسی قومی یا تعلیمی ادارے کے حصہ میں ایک پائی نہ آئی۔ چکلے پر بیٹھنے والی تو سوؤں سے مالا مال ہوئی مگر علی گڈھ اور ندوہ، اعظم گڑھ اور دہلی کو ایک حبہ بھی نہ ملا۔ مسلمانوں کی لن ترانیوں اور ان کے حقیقی عمل میں کس قدر فرق ہے!

لاہور اور اردو

لاہور میں غضب کی سردی تھی مگر پنجابیوں کے حسن سلوک اور ان کی مہماں نوازیوں نے دل میں اتنی گرمی اور جان

میں اتنی تازگی پیدا کی کہ بیرونی سردی زیادہ اثر نہ کر سکی۔ مختلف طبقوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ وہاں والوں کے حُسنِ سیرت کو دیکھ کر اپنے متعلق جو مغالطہ تھا دور ہو گیا پنجاب کے وزیرِ اعظم سر سکندر حیات خاں اور وزیرِ داخلہ خضر حیات دولتانہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کھدر پوش راجہ صاحب محمود آباد کے درشن نصیب ہوئے۔ پنجابیوں کی پگڑیاں بڑی بانکی ہوتی ہیں ان لوگوں کی جسمانی صحت اور سڈول بدن پر یہ طرے اور بھی زیادہ بانکے معلوم ہوتے ہیں حُسنِ صحت حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت کے اعتبار سے پنجابیوں میں متعدد خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اردو نوازی۔ اچھی طباعت، خوش نویسی اعلیٰ کتابت اور عمدہ جلد سازی میں لاہور سے بڑھنا تو بڑی بات ہے کوئی اس سے ہم سری بھی نہیں کر سکتا۔ غالب کے دیوان کے جیسے عمدہ مصور اور خوش نما ایڈیشن پنجاب سے نے شائع کئے ہیں وہ نہ صرف اردو بلکہ سارے ہندستان کے لئے قابلِ فخر ہیں۔

سر سیّد کی حاضر دماغی

کئی سال بعد علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ سر سید کے لگائے ہوئے پودے ہرے بھرے تناور درخت ہو گئے ہیں

ان کے پھل پھول دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے ایک شخص کی
ہمت اور عقلمندی پر آفرین ہے کہ اس نے کیا کیا دقتیں
اٹھائیں کیسے کیسے مالی مصیبتوں کا سامنا کیا مگر ہمت نہ ہارنا
تھی نہ ہاری۔ سرسید کے متعلق ایک قصہ معلوم ہوا۔ آپ نے
نہ سنا ہو تو آپ یقیناً دلچسپی سے سنیں گے اور اگر کبھی سنا بھی تھا
تو اس کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ بہرصورت آپ دل ہی دل میں
سرسید کی حاضر دماغی اور افادیت پسندی پر صاد کریں گے۔

قصہ یہ ہے کہ جب سرسید مسلمانوں کی قومی درس گاہ کے
لئے روپیہ جمع کر رہے تھے تو ایک طوائف نے دس ہزار
کا نقد چندہ بھجوایا تمام ٹرسٹی انکار پر تلے تھے اور رقم واپس
بھجوائی جا رہی تھی کہ سرسید کو اس کا علم ہوا انہوں نے فوراً منع
کیا تمام ٹرسٹی حیران ہو گئے۔ سنا ہے کہ ایک نے صاف
صاف کہہ دیا کہ ا۔

"حرام کی کمائیوں سے روپیہ لے کر آپ جس کالج کو
سینچیں گے اس کے علم و اخلاق کا کیا معیار ہو گا! کیا آپ کی
حالت ابھی سے ایسی گئی گذری ہو گئی ہے کہ ..... آپ
رنڈی بھڑووں کا پیسہ لینے بیٹھے ہیں۔"

سرسید نے جواب دیا:

"بھئی گھبراتے کیوں ہو؛ سمجھو تو کہ اس روپیہ کا بھی کوئی موزوں

مصرف نکل ہی آئے گا۔"

غرض سرسید نے روپیہ رکھ لیا، شکریہ کی رسید بھجوادی اور اس رقم سے مختلف حصوں میں بیت الخلا بنوا ڈالے۔ دینے والی نے نیک نیتی سے روپیہ دیا تھا لینے والے نے نیک نیتی سے روپیہ لیا اور ایک مفید غرض پر صرف کر کے دکھا دیا کہ نیک کام کرنا مفید کام کرنا ہے اور مفید کام کرنا۔۔۔ نیکی کرنا ہے۔ جہاں سرسید نے رشوت لینے والے، بددیانتی، استحصال، غصب، لوٹ اور فریب سے لما۔۔نے والے ہر پیشے اور طبقے کے "معززین" سے پیسہ لیا تھا وہاں انہوں نے "عصمت فروش" سے بھی زر قبول کر لیا۔ جب ضمیر فروشوں سے روپیہ لینے میں کوئی حرج نہیں تو عصمت فروشوں سے روپیہ لینے میں کیا قباحت ہے ؟ یہ بھی سرسید کی مصلحت شناسی تھی کہ انہوں نے تنگ نظر ٹرسٹیوں کی خاطر اتنی رعایت کی۔ بہر حال ان کی حکمت عملی قابل داد ہے کہ انہوں نے جھوٹی شیخی، بے موقع گھمنڈ اور برتر دائی نخوت سے متاثر ہو کر دس ہزار کا گراں قدر نقد چندہ کھونے نہ دیا۔

جب میں اپنے شہر میں اور دوسرے شہروں اور قصبوں میں لوگوں کو عام راستوں پر غلاظت کرتے اور گندگی پھیلاتے دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ ضرورت انہیں بدتمیزیوں پر مجبور کرتی ہے علی گڑھ کے یونیورسٹی والے خوش قسمت ہیں کہ وہ بدتمیزی

کرنے پر مجبور نہیں ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاق کا انحصار بڑی حد تک مادی دولت پر ہے ۔ اخلاق اور شرافت، تمیز اور تہذیب کی معاشی تاویل کیا غلط ہے کہ دولت اور سہولت ہیں صفائی اور پاکیزگی سکھاتی ہیں ؟ مادی سہولتوں کے ماحول میں انسان صفائی کا عادی اور نفاست کا شوقین ہو سکتا ہے غلاظت اور گندگی بیشتر انسانوں کے جمالیاتی احساسات کو غارت کر دیتی ہیں ۔ کسی کا کہا ہوا یہ جملہ مجھے بار بار یاد آ رہا ہے کہ

"وہی روپیہ اچھا ہے جس کا مصرف ٹھیک ہو اور
وہی آدمی بھلا ہے جس کا خاتمہ بالخیر ہو"

خود غرضوں کی مطلب پرستی

علی گڑھ ہی میں بعض مشتبہ قابلیت اور مخلوط اخلاق کے لوگوں کو دیکھ کر اس خیال کی تقویت ہوئی کہ بعض لوگ جو قومی اداروں کو چھدام بھی دینا گوارا نہیں کرتے اپنے مطلب اور فائدے کے لئے قومی اداروں اور تعلیمی درسگاہوں کو لوٹنے اور اس سے مستفید ہونے سب سے پہلے تیار ہو جاتے ہیں۔ لاہور میں بھی میں نے یہ مشاہدہ کیا۔ انجمن حمایت اسلام کی پچاس سالہ جوبلی منائی جا رہی تھی یہ وہی مشہور انجمن ہے جس کے

سالانہ جلسوں میں اقبال نے اپنی بہترین نظمیں سنائی تھیں، یہ وہی انجمن ہے جس کا شمار ہندستان کی بہترین رفاہی انجمنوں میں ہونا لازمی ہے، یہ وہی انجمن ہے جس نے عمل کے ذریعہ اپنے وجود کی ضرورت اور افادیت کو کئی بار ثابت کیا ہے۔ اعلحضرت کے تیس ہزار کے عطیہ کا اعلان کیا گیا، حکومتِ پنجاب نے بھی اُسی قدر رقم دی، اہلِ خیر نے مختلف رقمیں عطا کیں۔ غریبوں سے "پیسہ فنڈ" میں پیسہ پیسہ جمع کیا گیا مگر ایسی عمدہ انجمن کے لئے اور ایسے زرین موقع پر بھی بعض لوگوں نے باوجود استطاعت کے کچھ نہ دیا۔ انجان بن جانے والوں میں بعض بڑی بڑی ہستیاں تھیں اس قسم کے خود غرض مطلب پرستوں میں سے ایک کے صاحبزادے بی۔ اے جیسا معمولی امتحان وہ بھی معمولی درجے میں پاس کر کے ہندستان کی ایک مشہور درس گاہ میں قسمت آزمائی کے لئے آئے تھے۔ ان کے والد بھی ساتھ تھے جنہوں نے اس قومی درس گاہ کو باوجود استطاعت کے کچھ نہیں دیا تھا۔ انہوں نے ایسی جوڑ توڑ کی اور خوشامد اور منت سماجت کر کے ایسا زور باندھا کہ آخر اپنے کم اہل بیٹے کو دو ڈھائی سو کی خدمت پر چپکا ہی دیا۔ ان سے زیادہ قابل ان سے زیادہ مخلص، ان سے زیادہ شریف منہہ دیکھتے رہ گئے۔ بعض لوگ قومی درس گاہوں میں جان و

مال سے قربانیاں کرتے ہیں اور بعض لوگ جونک بن کر قوم پر پلتے ہیں بعض لوگ اپنے عیش اور آرام کو قوم پر سمیٹتے ہیں اور بعض عیش اور آرام کی خاطر قومی دولت سمیٹتے ہیں۔

کل ہند فلسفہ کانگریس کا "دیوالیہ"

الہ آباد میں کل ہند فلسفہ کانگریس ہوئی تھی مختلف صوبوں اور سمتوں سے لوگ آئے ہوئے تھے مگر تعداد کم تھی۔ علمی کانفرنسوں کی رونق کم ہو رہی ہے جس رفتار سے شرکائے کانفرنس کی تعداد گھٹ رہی ہے اس سے تیز تر رفتار سے کانفرنسوں پر جامعاتی عنایتیں کم ہو رہی ہیں۔ الہ آباد والے سابقہ کانفرنسوں کی مہمانداری کرتے کرتے کچھ تھک بھی گئے تھے کچھ علمی کانفرنسوں میں پہلی کی سی ندرت بھی باقی نہیں رہی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علمی جلسوں کی رونق بڑھانے کے لئے اپنی طرف سے مندوبوں کو بھیجنے کے لئے نہ تو یونیورسٹیاں تیار ہیں اور نہ مہمانداریوں پر فراوانی سے روپیہ خرچ کرنے کے لئے لوگ تیار ہیں بہرحال الہ آباد کی کوئی شکایت نہیں جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہے وہ گلے شکوے کے طور پر نہیں بلکہ صرف برسبیل تذکرہ ہے سچ پوچھئے تو جو کچھ بھی الہ آباد والوں نے کیا وہ اگرچہ ہم لوگوں کی من مانی توقعات سے کم تھا پھر بھی تذکرہ حالات کے تحت بہت تھا۔ بات گئی گذری۔ تذکرہ کے قابل کوئی بات نہ ہوتی

اگر ایک واقعہ نہ پیش آتا۔ ہوا یہ کہ کانفرنس کے آخری روز (مقررہ
پروگرام سے زائد!) کمشنر صاحب الٰہ آباد نے فلسفہ کانگریس کے
تمام ارکان کو عصرانے پر مدعو کیا یہ دعوت عین وقت پر دی گئی
تھی چنانچہ زبانی مدعو کرتے ہوئے کانگریس کے معتمد نے معذرت
چاہی تھی کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے رقعے نہیں تقسیم کئے جا سکتے۔
"ہر چہ از دوست می رسد نیکوست" کہتے ہوئے تمام شرکائے
کانگریس کمشنر صاحب کے دولت خانے کی طرف سدھارے
مگر بعضوں نے چلتے چلاتے کہہ ہی دیا۔
"آخر کسی نہ کسی کو احساس تو ہوا کہ مہمانوں سے کیسا سلوک
کیا گیا۔ غنیمت ہے کہ کمشنر صاحب کو ۔۔۔ جزوی تلافی کا خیال
ہوا!"

یہ ہے دنیا کوئی کیسی ہی نیکی یا مہربانی کرے یار لوگ کوئی نہ
کوئی فقرہ کس دیتے ہیں بھلا کمشنر صاحب کو کیا پڑی تھی کہ وہ یونیورسٹی
کی ذمہ داریوں کی تکمیل کرنے بیٹھتے؟ اس بیچارے نے علم دوستی سے
متاثر ہو کر بلا لیا اور یار لوگوں نے چٹ سے ایک بات جوڑ دی۔
غرض سب لوگ بچارگی دعوت میں چلے گئے۔ ایم جیاں دنیا کی
بہت سی نعمتوں سے محروم ہے عصرانوں اور ٹی پارٹیوں میں بھی
شریک نہیں ہوتا ۔۔۔ وہ نہ کیک کھائے، نہ بسکٹ نہ آئیسکریم
پیئے نہ لیمن نہ چائے نہ شربت! لہٰذا وہ جا کر کیا کرتا؟ لوگوں سے

ملتا ؟ سو دو تین دن سے کافی ملاقاتیں ہو چکی تھیں خیال کیا کہ وہی
لوگ آج بھی ہوں گے جو کل تھے، پرسوں تھے۔ ہماری طرح
یہاں بھی لوگ عہدہ داروں کو زیادہ بلاتے ہیں، ہیر پھیر کے
وہی لوگ ہوتے ہیں جن سے ہمیشہ ملاقاتیں ہوتی ہیں! لہذا
چلو گنگا جی کی سیر کریں سنگم کی بہار دیکھیں۔ اور کچھ نہیں تو دل بہل جائیگا
غرض دعوت چھوڑ میں تو سنگم پہنچا۔ تھوڑی دیر سیر کے بعد گھر واپس
آیا، سامان ٹھیک ٹھاک کرکے اپنے میزبان سے باتیں کر رہا
تھا کہ وہ صاحب بھی پہنچ گئے جو میری طرح فلسفہ کانگریس میں
شرکت کی غرض سے آئے ہوئے تھے اور اسی گھر میں مہمان تھے
جب ہم چلنے کو ہوئے تو میں نے بھی از روئے احتیاط بٹوا نکال کر
دیکھ لیا کہ واپسی کا ٹکٹ ہے یا نہیں۔ میرے ساتھی نے بھی
اسی لئے جو جیب سے ٹکٹ نکالنا چاہا تو بٹوا غائب! دوسری
جیب میں دیکھا دوسری جیب ٹٹولی، بار بار جیب میں ہاتھ ڈالا،
چھوٹا دستی بکس ڈھونڈھ ڈالا، بڑا صندوق کھلوایا، تمام کپڑے
تتر بتر کر ڈالے مگر بٹوا نہ ملا۔ ہمارے میزبان کے لڑکے شرم زدہ حیرت
میں کھڑے تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ بٹوے میں نہ صرف واپسی
کا ٹکٹ تھا بلکہ دو ڈھائی سو روپے بھی تھے تو وہ اور پشیمان ہوئے
ریل کا وقت قریب آ گیا تھا لہذا میں تو چلا گیا اور وہ وہیں رہ پڑے
کہ جہاں جہاں وہ گئے تھے وہاں بٹوا تلاش کرتے پھریں اسٹیشن پر

معلوم ہوا کہ کانگریس میں شرکت کرنے والوں میں سے ایک اور کا بٹوا غائب ہوگیا، کانپور اور اٹاوہ پھیرتا ہوا جب میں علی گڑھ پہنچا تو معلوم ہوا کہ علی گڑھ سے پانچ طالب علم اور ایک پروفیسر صاحب گئے تھے۔ تمام طالب علموں کے روپئے ایک ہی صاحب کے پاس تھے، جو سب سے زیادہ ہوشیار اور اس پارٹی کے خازن تھے، پانچوں کی واپسی کے ٹکٹ بھی انہی بٹوے میں تھے ٹکٹ کے علاوہ لشہ لغہ روپیہ تھے "ہوشیار خاں" اور غائب دماغ پروفیسر دونوں کے بٹوے اڑائے گئے تھے کئی اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی اور بعد میں معتبر ذریعہ سے بھی معلوم ہوا کہ کوئی شاطر "جیب کترا" کمشنر صاحب کے عمرانے میں پہنچ گیا تھا اور نفسیات، الٰہیات اور مابعد الطبیعیات میں "کھوئے ہوئے" فلسفیوں کو اس نے خوب لوٹا تھا اور لطف یہ کہ فلسفہ کانگریس کے ارکان سمجھ رہے تھے کہ کمشنر صاحب کا کوئی عزیز یا دوست ہوگا اور کمشنر صاحب اس غلط فہمی میں تھے کہ وہ بھی کوئی ــــ فلسفی ہوگا۔

علی گڑھ کی ایک "دوستانہ" محفل میں بٹوا کھونے والے پروفیسر کے ایک ــــ گہرے دوست سارا قصہ سنا رہے تھے۔ یار لوگ بڑا مزہ لے رہے تھے اور خوب فقرے چست کر رہے تھے

"بھئی خود انہوں نے مجھ سے کہا ہے اور میں ان ہی کے لفظوں میں آپ کو یہ قصہ سنا رہا ہوں ان کا بیان ہے کہ "میں اپنے میزبان کے لڑکوں کو سنیما لے جانے والا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ ان ہی سے روپیہ مانگ کر

ان کو سینما لیجانا پڑے گا؟ جب میں کمشنر صاحب کے عصرانے سے لوٹا ہوں تو سردی زیادہ ہو گئی تھی۔ خیال کیا کہ شیروانی اتار کر گرم سوٹ پہن لوں جب میں کپڑے بدل چکا تو شیروانی کی جیب سے بٹوا نکالنے کے لئے جو میں نے ہاتھ ڈالا تو میرا ہاتھ جیب کی تہ کو نہیں پہنچا"

ایک "ہمدرد" نے کہا

"نہ ہاتھ جیب کی تہ کو پہنچا نہ خود فلسفے کی تہ کو پہنچے" اس چٹ پر ایک بڑا قہقہہ ہوا۔ سب فقرہ چست کرنے والے کی طرف متوجہ ہوئے "کیا کہا ہے! کیا کہا ہے" کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک صاحب ہاتھ سے ہاتھ ملتے جا رہے تھے "شاباش" "شاباش!" کہتے جا رہے تھے فرطِ انبساط سے مجبور ہو کر نہ صرف فقرہ چست کرنے والے سے بلکہ اوروں سے بھی ہاتھ مارتے جا رہے تھے اور بار بار کہے جا رہے تھے کہ کیا کہا ہے۔ نہ جیب کی تہ کو پہنچے نہ فلسفہ کی تہ کو پہنچے" جس کمال سے فقرے باز صاحب سُنے ہوئے فقرہ کو دہرا رہے تھے اور جس کمال اداکاری اور آواز کی اتار چڑھاؤ سے اس وقت کی کیفیت کا نقشہ پیش کر رہے تھے وہ واقعی داد طلب تھا۔

غرض اخباروں میں، محفلوں میں، بزم اغیار میں اور دوستوں میں دو چار دن یہی ذکر ہوتا رہا۔ کمشنر اور پولس پرنٹنڈنٹ، در

فلسفیوں پر خوب پھبتیاں ہوئیں ایک صاحب نے تو مجھ سے بھی صاف کہہ دیا: "آپ کا بٹوا بھی ضرور غائب کیا گیا ہوگا یہ آپ نے عقلمندی کی کہ بٹوا کھو کر انجان بن گئے!" بہرحال اس بٹوے باز کی وجہ سے چند دن خوب گفتگو کا موقع ملا۔ چند لوگوں کو روپیہ کا نقصان ضرور ہوا مگر جتنا روپیہ ان لوگوں نے کھویا اس ایک شخص نے حاصل کر لیا اور ساری قوم کو شماتت کی بدولت جو خوشی ہوئی وہ قومی نفع!! وہ محفل بھی یاد رہے گی۔ ایک کے کمال نے سب کو بار بار خوش کیا تھا اور ایک فقرہ کو مختلف طریقوں سے ادا کرکے رنگینی پیدا کی تھی۔

جاگیردار صاحب کی زباں دانیاں

ریل کی "دوستیاں" بھی خوب ہوتی ہیں۔ میں تنہا ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سکندر آباد پر ایک سفید پوش اور خوش باش حضرت تشریف لائے۔ ڈبے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے بڑی تپاک سے "آداب عرض ہے" کہا۔ سامان رکھوا تے جا رہے تھے، قلیوں کو رہ رہ کر ڈانٹ رہے تھے، اپنے ملازم کو ہدایتیں بھی دیتے جا رہے تھے اور مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے مختلف اور بے ربط جملوں کی "تلواہٹ" سے اُن کے سکون قلب کا پتہ چل رہا تھا۔ ریل ابھی شہر سے باہر

بھی نہیں گئی ہوگی کہ ایسی باتیں شروع ہوگئیں گویا وہ اور ہم برسوں کے ساتھی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اپنی جاگیر تشریف لے جارہے ہیں نصف شب تک ساتھ رہے گا سفر کا مقصد شکار ہے بڑا اصرار کر رہے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں بڑی مصیبتوں سے میں نے جان چھڑائی مگر یہ وعدہ کرنا پڑا کہ ممکن ہوا تو واپسی پر ضرور ان کی جاگیر بھی دیکھتا جاوں گا۔ حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ مجھے خلاف توقع ان کے ہاں جانے کا موقع ملا جس وقت میں ان کی کوٹھی پر پہنچا وہ وراںڈے میں ٹہل رہے تھے مجھے دیکھتے ہی بڑی تپاک سے خیر مقدم کرنے دوڑے جب میں اتر چکا تو انہوں نے اپنے باغ کے مالی کو جو سامنے ہی کچھ کام کر رہا تھا آواز دے کر کہا:

"ارے۔ اکّارا! اُیول کی پلو سورا!! دورا کا سامان اُتئی رے ؟ وہ ٹانگے میں سے آتار! ارکو!! ناشتہ جلدی تیار کر دجیو!!"

ان ہی فقروں سے جاگیردار صاحب کی تلنگی دانی اور روانی کا اندازہ ہوگیا۔ مشیخت زدہ انسان ہمیشہ تعریفی کلموں کے لئے بے قرار رہتا ہے جاگیردار صاحب بھی مجھ سے داد چاہتے تھے مگر مجھے خاموش دیکھ کر خود ہی کہنے لگے۔

"بھئی ہم لوگوں کو یہ اور مصیبت ہے زبانیں سیکھتے سیکھتے ناک میں دم آجاتا ہے! انگریزی جاننا لازمی

ہے۔ اردو تو خیر اپنیچ زبان ہے اور کم میں بھرتی یہ کہ
رعایا کی خاطر تلنگی جاننا بھی ضروری ہے۔"

مجھ سے کچھ جواب بن نہ پڑا خاموش ہی رہا۔ وہ مجھ سے تعریف سننے کی امید رکھتے تھے اور یہاں جھوٹی باتیں بنانے کا ہنر ہی نہیں۔ یہی غنیمت ہے کہ میں نے ان سے صاف صاف یہ نہیں کہا کہ

"رعایا کی خاطر تلنگی بعد میں سیکھتے رہیئے پہلے 'اپنیچ'
زبان تو سیکھ لیجئے"

زبانوں کے مسئلہ سے دلچسپی ہونے کے بعد مجھے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ بالعموم حیدرآباد کے عہدہ داروں اور جاگیرداروں کی استعداد ملکی زبانوں میں پانچ دس بے تکے جملوں اور پچیس تیس لفظوں تک محدود ہوتی ہے اور ان ہی کو وہ فرض غرض سے استعمال کر کے موقع بے موقع اپنی تلنگی کی مہارت جتاتے ہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ جتنے لفظ مثلاً نیل، تیسکرا، پو، ورو یہ جانتے ہیں، ان ہی کے مترادف اتنے ہی لفظ ان کے ملازم بھی سمجھتے ہیں! اس کے بعد نہ یہ کچھ بول سکتے ہیں نہ وہ کچھ سمجھ سکتا ہے، جو کچھ ہوتا ہے وہ صیغہ داروں، پٹیلوں، پٹواریوں کے توسط سے ہوتا ہے یا محض اشاروں پہ سرکاری اور خانگی کاروبار چلتا ہے!

ایک قصّہ

یہاں مجھے ایک دلچسپ قصہ یاد آیا۔ محض تفریح طبع کے لئے لکھ رہا ہوں سنا ہے کہ ایک عہدہ دار صاحب جو حقیقت میں شکار کے بہت شوقین تھے دورہ کرتے ہوئے آصف آباد کے قریب آئے ہوئے تھے دن بھر دفتری کام ہوتا رہا۔ شام کے وقت عہدہ دار صاحب اپنی قیام گاہ کے سامنے ٹہل رہے تھے "اتفاق" سے مقامی دفتر کے صیغہ دار بھی سلام کے لئے آنکلے۔ ان میں باتیں ہونے لگیں شام ہوچکی تھی نویں کا چاند آسمان اور زمین کو منور کر رہا تھا اس رومانی فضا میں عہدہ دار صاحب نے پوچھا کہ

"کہئیے یہاں کچھ شکار بھی ملتا ہے؟"

صیغہ دار صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

"جی ہو سرکار بورنچے، نیل گائے اور ——"

عہدہ دار صاحب نیک آدمی تھے۔ صیغہ دار کے شوقِ شکار اور ذوقِ انتخاب کو معلوم کر کے مسکرا کر خاموش ہوگئے!

ایک اور قصّہ

اٹاوہ میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جنھیں حیدرآباد

سے بڑی دلچسپی ہے، سالہا سال حیدر آباد میں رہ چکے ہیں۔ بڑے
شوق سے حیدر آباد کے متعلق باتیں سنتے ہیں اور سناتے ہیں۔ میں نے
ان سے کہا کہ وہ حیدر آباد کے نیم تاریخی قصے بھی بہت دلچسپ اور
بسا اوقات بہت سبق آموز ہوتے ہیں"۔ کہنے لگے

"ہاں۔ خوب یاد آیا کئی سال قبل نیرنگ خیال میں
مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں
حیدر آباد کے متعلق بڑے سے عمدہ عمدہ قصے لکھے
تھے۔ تعجب ہے کہ یہ نہایت دلچسپ مضمون مرزا صاحب
کے مضامین میں کیوں نہیں شائع ہوا؟ وہ تو اس قابل
ہے کہ مختلف رسالوں میں شائع کیا جائے تاکہ زیادہ
سے زیادہ لوگ لطف اندوز ہوں میں نے نیرنگ خیال
کا وہ نمبر بڑی احتیاط سے رکھا ہے اگر کوئی ایڈیٹر اس
مضمون کو نقل کرنا چاہے تو میں دے سکتا ہوں"۔

کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگے:

"مجھے بھی حیدر آباد کے امیروں اور عہدہ داروں کے
متعلق بڑے اچھے اچھے قصے معلوم ہیں"

چنانچہ میرے اصرار پر انہوں نے دو چار قصے سنائے جس
میں سے ایک ہدیہ ناظرین کرتا ہوں:

حیدر آباد کے ایک بہت بڑے عہدہ دار کی خدمت میں ایک

محضر پیش ہوا محضر ان لوگوں کی طرف سے تھا جو سرکاری قرضہ حاصل کر کے تعلیم اور تفریح کی خاطر انگلستان گئے تھے اور وہاں سے ڈگریاں لانے کے بعد مختلف عہدوں پر مقرر کئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض ۱۰۰۰ [illegible] سے زیادہ اور اکثر تین چار سو ماہانہ تنخواہ اٹھا رہے تھے محضر پیش کرنے والوں کی درخواست تھی کہ ان کا قرضہ معاف کر دیا جائے اور دلیلیں یہ پیش کی گئی تھیں کہ "ان کا قرضہ تعلیمی قرضہ ہے۔ قرضے کر انہوں نے تعلیم حاصل کی، تعلیم کی وجہ سے ان میں مہارت اور قابلیت نمودار ہوئی، اس مہارت اور قابلیت سے ملک مستفید ہو رہا ہے نہ یہ قرضہ لیتے، نہ تعلیم پاتے، نہ قابل بنتے اور نہ ملک مستفید ہوتا!! لہذا قرضہ معاف ہو جانا چاہیے" اگرچہ محضر کے اصلی الفاظ مختلف ہوں گے مگر ان کا مطلب یہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے بہرحال یہ محضر نما درخواست نامنظور ہوئی پھر بھی تعلیم یافتہ ڈگری داروں کا یہ گروہ "حق و انصاف" کے مطالبے پر اڑا رہا اور چند دنوں کے بعد پھر ایک کوشش کی گئی۔ حالات ناموافق تھے لہذا انہوں نے مصلحتاً یہ معروضہ پیش کیا کہ کم سے کم تعلیمی قرضہ کا کل سود معاف کر دیا جائے نظامت سے تائید ہوئی معتمدی سے بغیر تائید یا مخالفت [illegible] کو آگے بڑھا دیا معاملہ [illegible] فیصلے کے لئے [illegible] نظام کر لیا تھا

کہ حاکم اعلیٰ آخری فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے ان عہدہ داروں کے وفد کو شرف ملاقات بخشے تاکہ اُن کے نمایندے اپنے تحریری معروضے کی زبانی توضیح بھی کرسکیں غرض وقت مقررہ پر وفد (با مسل زفائل) پیش ہوئی، درخواست پڑھی گئی، زبانی توضیح ہوئی۔ بالآخر حاکم نے پوچھا:

"درخواست میں لکھا ہے کہ بوجوہ متذکرہ اگر حکومت ہمارا خیال فرما کر انصاف کرے تو عین رعایا پروری ہوگی۔ رعایا کون ہے؟"

وفد کے ارکان نے ایک زبان ہو کر کہا:

"ہم"

جواب ملا

"کیا کہا؟ تم؟ تم میں سے ہر ایک کو اچھی خاصی تنخواہ مل رہی ہے۔ حکومت ہی کے پیسے سے تم نے تعلیم پائی ہے! حکومت ہی کی عنایت سے تمہیں یہ نوکریاں ملی ہیں۔ ہر شخص ہر مہینہ مقررہ تنخواہ اٹھا رہا ہے اور تمہیں قرض کا ادنیٰ ترین سود بھی ادا کرنا ناگوار گذرتا ہے!!! (وفد کی جسارت اور اس کے پیہم اصرار کا خیال کرکے ذرا بگڑ کر) تمہاری وجہ سے خزانہ خالی ہو رہا ہے تم رعایا نہیں ہو۔ رعایا وہ [illegible]

خزانہ خالی کرنے والے عہدہ داروں اور خزانہ بھرنے والی رعایا کی امتیازی خصوصیت جن چبھتے ہوئے لفظوں میں بیان کی گئی وہ تعریف سے بالاتر ہے۔ جن لوگوں کے پیش نظر تاریخ اسلام کا ابتدائی شاندار دور ہے، جن لوگوں کی نظر سے معاشیات اور مالیات کی کتابیں گذر چکی ہیں، جو لوگ بیش قرار تنخواہ پانے والے اور گوناگوں اقسام کے الاؤنس اٹھانے والے عہدہ داروں سے واقف ہیں، وہ یقیناً اس بات کا اعتراف کرینگے کہ خزانہ خالی کرنے والے عہدہ داروں اور خزانہ بھرنے والی رعایا کا فرق بہت قابل غور اور سبق آموز ہے۔

عورتوں سے حُسنِ سلوک

عورتوں کی تحقیر آمیز ناقدری ہندستانی مسلمانوں کے دور تنزل کی ایک عام خصوصیت تھی۔ مردوں میں شیورلری کا احساس تقریباً مفقود ہو گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سنہ ۱۹۱۹ء میں ایک متوسط درجے کے سرکاری ملازم مع اپنی بیوی کے سفر کر رہے تھے وہ خود دوسرے درجہ میں تھے اور ان کی بیوی بچے ــــ تیسرے درجے میں سنہ ۱۹۲۹ء میں دونوں میاں بیوی دوسرے درجے میں سفر کر رہے تھے اور سنہ ۱۹۳۹ء میں میں نے دیکھا کہ ان کی بیوی بچے دوسرے درجے میں تھے اور وہ خود ــــ تیسرے درجے میں!!

بیس سال کے عرصے میں بعضوں جماعتوں کی ذہنیت میں کیسا انقلاب ہوا ہے۔

حیدرآبادی جھٹکا اور معاشرتی درجے

حیدرآبادی "تانگا" اور جھٹکا متوسط طبقے کی عام سواریاں ہیں جو آگرہ اور اودھ کے تانگوں اور یکوں سے زیادہ تکلیف دہ اور بدنما ہیں۔ قاضی پیٹ سے ورنگل تک خاصہ آٹھ دس میل کا فاصلہ ہے مجبوراً اسی جھٹکے میں بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے جلدی تھی جھٹکا [illegible] اب ہمارا راستہ بدتر تھا، ٹٹو کمزور تھا مگر [illegible] عام کی توقع اور [illegible] طرح چابک کو سمجھتے نہیں [illegible] اور جھٹکا [illegible] جا رہا تھا۔ چابک کی آواز [illegible] پہیوں [illegible] اور جھٹکے بان کی صدائیں خاص [illegible] شہر [illegible] دیسی صاحب بہادر سوٹ بوٹ [illegible] چلے جا رہے [illegible] جھٹکے والے نے ملائم لہجے میں کہا۔

"چلیے صاحب! بیٹھیے جناب!"

تھوڑی دیر بعد ایک سفید پوش صاحب کاندھے پر رومال ڈالے راستہ سے گذر رہے تھے۔ جھٹکے والے نے صاف آواز میں کہا۔

"چلو صاحب! ہٹو میاں!"

جب راستے کے قریب ایک شخص ننگے پیر، معمولی لباس پہنے دکھائی دیا۔ جھٹکا نزدیک آنے سے پہلے ہی وہ چلا جا سکتا تھا مگر جھٹکے والے نے زور سے کہا:-

''سر کو جی! دیکھتے نہیں ہو؟''

ذرا آگے بڑھتے ہی ایک غریب کمل پوش نظر آیا وہ بھی راستے سے گذرنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھ کر جھٹکے والا آپے سے باہر ہو گیا اور للکار کر کہا۔

''ہٹ بے! اندھے!!''

وہ بیچارا سہم کر خاموش ہو گیا اور اس طرح آنکھ بچا کر نکل گیا مانو اس نے کوئی جرم کیا تھا اور ''پٹنے'' جانے سے بچ گیا! ان کی مرعوبیت ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے اسی ایک مثال سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہماری معاشرت کس طرح مختلف طبقوں میں منقسم ہے اور ان مختلف طبقوں کے افراد کے ساتھ جھٹکے والے بھی کس طرح سلوک کرتے ہیں!!

ہر صوبے میں مرکزی اردو کتب خانوں اور سارے ہندوستان کے لئے ایک صدر مرکزی کتب خانہ کی ضرورت

برسوں ہوئے ''علم المعیشت'' میں پڑھا تھا کہ سر محمد اقبال نے

ایک کتاب ـــــ اصول معاشیات کے متعلق لکھی تھی کتاب کا نام "علم الاقتصاد" ـــــ بھی یاد رہ گیا تھا۔ دوران سفر میں اس کتاب کا خیال آیا اور مطلوبہ کتابوں کی فہرست میں اس کا بھی نام شریک کر لیا۔ ہر جگہ دریافت کیا۔ لاہور اور دہلی، کانپور اور الٰہ آباد، آگرہ اور علی گڑھ کے کتب فروشوں کے پاس ایک نسخہ بھی نہ ملا۔ علی گڑھ کی لٹن لائبریری میں دریافت کیا وہاں بھی یہ کتاب نہ ملی۔ اس کتب خانہ کو قائم ہو کر ساٹھ برس سے زیادہ ہو گئے ہیں لٹن لائبریری کے قائم کرنے والے، اس سے مستفید ہونے والے اور اس کی خاطر روپیہ دینے والے سب کے سب نہیں تو زیادہ تر یقیناً اردو داں تھے اور اردو سے کچھ نہ کچھ ہمدردی ضرور رکھتے ہوں گے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب بھی یونیورسٹی کے چلانے والے، یونیورسٹی میں پڑھانے والے تقریباً سب اردو داں ہیں۔ علی گڑھ نے اردو نثر اور اردو نظم کی تشکیل جدید میں جو حصہ لیا ہے وہ واقف کار حلقوں میں ہمیشہ قابل قدر تصور کیا گیا اور یہ بھی اتفاق نہیں بلکہ علی گڑھ کی اردو مرکزیت کا ثبوت ہے کہ جدید دبستان اردو کے کئی منور ستارے (اپنے اپنے وقت میں) علی گڑھ پر ضو فشاں رہے۔ سرسید تو علی گڑھ کی درس گاہ کے باوا آدم تھے ہی نگران کے علاوہ شبلی اور حالی، محسن الملک اور محمد علی اور بیسیوں نامور اہل قلم، اہل زبان اور

اہلِ دل علی گڑھ سے وابستہ رہ چکے ہیں آج بھی اردو کی علمی تحقیق کرنے میں اور اردو زبان کا علمی و ادبی سرمایہ بڑھانے میں علی گڑھ کے استادوں اور شاگردوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ علی گڑھ کا ذریعہ تعلیم شروع سے انگریزی تھا اور اب بھی ہے مگر وہاں کی فضا شروع ہی سے اردو کے لئے موافق تھی اور اب تک علی گڑھ کی اردو نوازی اور اردو پسندی بدستور قائم ہے۔[1]

---

[1] اس کے برخلاف حیدرآباد کی یونیورسٹی میں صرف ذریعہ تعلیم اردو ہے مگر اکثر اساتذہ طالب علم، ارباب جامعہ اور ــــ دفتر بھی انگلش پرست ہے میں نے بعض لوگوں کو اردو جامعہ کے بعض استاد اور طالب علموں کے متعلق یہ کہتے سنا ہے:۔

"اس کی ـــ انگریزی بہت اچھی ہے! خوب بولتا ہے"

"اس کی انگریزی تحریر لاجواب ہے"

اردو دانوں کی انگریزی سے مرعوبیت کی یہ تنہا مثالیں نہیں ہیں لڑکوں میں بھی جس کثرت سے (فخریہ طور پر) انگریزی لفظ استعمال ہوتے ہیں وہ ہماری افسوسناک ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔

دفتر جامعہ کی انگلش نوازی کے متعلق مقامی صحافت میں اتنے گلے شکوے ہو چکے کہ اس کی بابت اور کچھ لکھنا نہ صرف بے محل بلکہ بے فائدہ بھی ہے!

مگر اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ یعنے
اس عمدہ گرد و پیش کے باوجود لٹن لائبریری میں نئی اور
پرانی اردو کتابوں کی کمی۔
اگر ارباب جامعہ نے اور کچھ نہیں تو اس مدت کی تمام عمدہ
یا قابل لحاظ اردو تصنیفوں، تالیفوں اور ترجموں کو مہیا کر لیا ہوتا
اور تمام مستند اور معیاری اردو رسالوں کو باضابطہ طور پر محفوظ رکھا
ہوتا تو اسی ساٹھ سال عرصے میں علمی و ادبی اردو سرمایہ کی بدولت
علی گڑھ سارے ہندستان میں اردو کا بہترین کتب خانہ ہوتا مگر اب!
دوسری یونیورسٹیوں کی طرح وہاں بھی تھوڑی بہت عنایت اردو
کتابوں پر ہو جاتی ہے اور بس! میں سمجھتا ہوں کہ تحفوں اور تبادلوں
کے ذریعہ ہی علی گڈھ کو ہر سال کئی رسالے اور کتابیں مفت ملتی
ہوں گی مگر ان کی حفاظت کا معقول انتظام نہیں کیا گیا۔
حالیہ سفر میں مجھے یہ تکلیف دہ واقفیت ہوئی کہ سارے
ملک میں ایک بھی کتب خانہ نہیں جہاں گذشتہ اور موجودہ زمانے
کی مطبوعہ اردو کتابیں یکجا مل سکیں۔ جہاں جہاں گیا موقع محل کے
لحاظ سے لوگوں سے دریافت کیا کہ فلاں کتاب کہاں ملے گی؟
اردو کا سب سے بڑا کتب خانہ کون سا ہے؟ ہر صوبے کی تمام
اردو اشاعتوں کو محفوظ کرنے کے لئے ہر صوبہ میں کم سے کم ایک
اردو اشاعت گھر اور کسی موزوں مقام پر اردو کا ایک صدر

مرکزی کتب خانہ کیوں نہیں قائم کیا جا سکتا؟ ان سوالوں کا کہیں تشفی بخش جواب نہیں ملا بلکہ مجھے یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ اردو کی مطبوعہ کتابوں کا سب سے زیادہ ذخیرہ کہاں ہے؟ سرکاری اور خانگی تعلیمی اور قومی کتب خانوں میں ایک ہی روح کار فرما ہے مکمل فہرستیں کہیں سے شائع نہیں ہوتیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دار المصنفین یا انجمن ترقی اردو، جامعہ ملیہ یا لاہور یونیورسٹی میں کتنی اور کون کون سی کتابیں ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب پر ایک پردہ راز گرا ہوا ہے اور کسے کیا خبر کہ در پردہ ـــــ کیا ہے؟ اور کیا ہو رہا ہے؟

اسی سفر میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اردو کے محسن اعظم مولوی عبد الحق صاحب انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ کے لئے گذشتہ زمانے کے اردو رسالے بڑی محنت اور تلاش سے "بصرف زر کثیر" جمع کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ کے کار نیک کا ہم دل سے خیر مقدم کرتے ہیں مگر کوئی ہماری یہ آواز ان تک پہنچا دے کہ

"جیسے تیس چالیس سال قبل کے پرچے آج دگنے تگنے داموں بھی نہیں مل رہے ہیں، اسی طرح آج کے پرچے تیس چالیس سال بعد اتنے کمیاب ہو جائیں گے کہ وہ دگنے تگنے داموں بھی آسانی سے دستیاب

نہ ہوں گے اور اسی زمانے کے بیسیوں رسالوں، ان ہی
"معارف" اور "کلیم"، "نگار" اور "ہمایوں"،
"ادبی دنیا" اور "نیرنگ خیال" وغیرہ کی مانگ ہو گی تلاش
کیجئے گا بھی تو یہ رسالے آسانی سے کہیں نہ ملیں گے

کیا اب بھی ہم خواب غفلت سے چونکنے آمادہ نہیں ہیں؟
ساری دنیا میں ہر قوم و جماعت اپنی زبان کی قدر کر رہی ہے
اور اپنی زبان کے کل علمی و ادبی، فنی اور اصطلاحی ادب کو محفوظ
رکھ رہی ہے۔ حد یہ کہ زبان کی مختلف بولیوں، ان کے گیتوں اور
گانوں کو بچانے کی منظم کوشش کر رہی ہے اور ہم ہیں کہ اپنی زبان
کی خاطر خواہ طور پر حفاظت نہیں کرتے، ہندی کو کچلنے کی فکر
میں بدحواس ہیں۔ بقول شخصے "معشوق کی تو پروا نہیں کرتے،
رقیب کی گردن کی تلاش میں پھر رہے ہیں"!!

اردو کی قدر جب خود اردو داں نہیں کرتے۔ اردو کو بحیثیت
مادری زبان بولنے والوں کو جب اردو کے حال اور مستقبل
کی پروا نہیں تو پھر گورمنٹ کی ناقدری، اغیار کی بے توجہی،
مخالفوں کی دشمنی کی شکایت کس منہ سے کرتے ہیں؟ جب اردو
بولنے والے متمول گھرانوں، انگریزی داں جاگیرداروں،
مغرب پسند رئیسوں اور انگریزیت زدہ عہدہ داروں میں فرنگی
زبانوں کا طوطی بول رہا ہو، جب بڑا فخر اس بات پر ہو کہ بچپن سے

تعلیم ایٹن یا ہیرو میں یا کسی اور انگریزی درس گاہ میں ہوئی ہے، سال ہا سال انگلستان میں رہ چکے ہیں "فرینچ" بھی تھوڑی بہت آتی ہے، انگریزی میں "مہارت تامہ" رکھتے ہیں، شکسپیری عہد کے انگریزی ادب کے مستند نقاد مانے جاتے ہیں،

اینک آرڈن کے ایک مصرعے کے نئے معنی پہنا کر اپنی انگریزی دانی کا سکہ بٹھا دیا ہے ان کے کتب خانہ میں اسکر وائلڈ کی تمام تصنیفیں ہیں مشہور انگریزی کتابوں کے پہلے اڈیشنوں کو جمع کرنے کا خبط ہے اسی پر ماں باپ کی بچائی ہوئی، خود کی کمائی ہوئی غیروں سے ستائی ہوئی پونجی لٹ رہی ہے جہاں صبح میں ٹائمز اور شام میں ایوننگ نیوز آتے ہوں جن کے ہاں آنے والے ماہناموں کے نام سٹرانڈ اور ٹرو، سٹوری، علمی رسالے اسفیر اور جاگرافیکل میگزین وغیرہ ہوں جنہوں نے معارف اور کلیم، سائنس اور شاہکار کے نام بھی نہ سنے ہوں، حد وانتہا یہ کہ جن کا پالتو طوطا "مٹھو بیٹے" نہیں "ڈیم فول" بولتا ہو تو پھر غیروں کی وجہ سے اردو کی تباہی و بربادی کی کیا شکایت ہو سکتی ہے؟ بجز مستثنیات کے عام طور پر میں نے یہی دیکھا کہ اردو اخبار یا رسالوں اور کتابوں کی تھوڑی بہت جو کچھ بھی قدر ہوتی ہے وہ معمولی کھاتے پیتے گھرانوں میں متوسط طبقے کے خاندانوں میں

اور ظاہر ہے سب سے بڑھ کر غیر انگریزی داں اردو جاننے والوں میں۔
کاش اب بھی لوگوں کو احساس ہو کہ سارے ملک میں
ایک ہی مرکزی کتب خانہ قائم کیا جائے جہاں ہر مطبوعہ کتاب کے
علاوہ تمام اردو ماہناموں اور مختلف سمتوں کے عمدہ اخباروں
کا انتظام کیا جاسکے! سارے ملک میں کم سے کم علم اور ادب
کا ایک ہی اردو خزانہ ایسا ہونا چاہیے جس سے علم و ادب کے
طالب مستفید ہو سکیں! کیا علی گڑھ اس کے لئے کچھ نہیں کرسکتا؟

شاعری اور اصلاح معاشرت

آج کل کچھ بھی اصلاح کرنی ہو تو پروپگنڈا کیا جاتا ہے۔ تقریریں
کیجاتی ہیں، مضمون بازی ہوتی، مباحثے ہوتے ہیں، قانون ساز
جماعتوں میں تجویزی قانون پیش کیا جاتا ہے جو کم سے کم ایک
مرتبہ نام نہاد واقف کاروں کی ذیلی مجلس میں پیش ہوتا ہے۔
پھر اِدھر اُدھر مختلف دفتروں اور کمیٹیوں کی سیر کرتا مجلس مقننہ
میں آتا ہے، وہاں از سر نو بحث مباحثہ ہوتی ہے اتنی ترمیمیں ہوتی
ہیں کہ بعض مرتبہ اصل مسودہ کا ایک فقرہ بھی "ترمیم" شدہ قانون
میں نہیں رہتا۔ اس کے بعد لاٹ صاحب کی دستخط ہوتی ہے
نفاذ قانون کی تاریخ معین کی جاتی ہے اور اس کے بعد تاویلوں بازیوں
کا سیلاب شروع ہوتا ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات قانون

کے منشار و مرضی کے خلاف عمل درآمد شروع ہوتا ہے تا دیل از کی
کی سب سے زیادہ "شاندار" مثال قانون شراب بندی ہے۔
قانون کو بنانے والا کانگریسی ہی نہ رہا تو پھر قانون کس کام
کا ؟ چنانچہ بمبئی کے قانون شراب بندی میں ایک گرفت نکال کر
اس کو بھسم کر دیا گیا یہ تو نئی روشنی کے اصلاحی قوانین کا ذکر ہے
میں دراصل پرانے اور نئے زمانوں کی اصلاحی پالیسیوں میں مقابلہ کرنا نہیں چاہتا
بلکہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ پرانے زمانے میں کس طرح اصلاح کی جاتی تھی
چنانچہ اس قسم کی ایک حقیقی اصلاح کا علم مجھے حالیہ سفر میں ہوا۔
اٹاوہ میں ایک باخبر شخص ہیں جنھیں اصلاح معاشرت، زبان
وادب، ہندی اور اردو، سنسکرت و فارسی سے بڑی دلچسپی ہے۔
غضب کا حافظہ ہے۔ ہزاروں دوہے اور شعر یاد ہیں بڑے
مزے مزے کے قصے سناتے ہیں جن سے ہر شخص بقدر توفیق
مستفید ہو سکتا ہے ایک روز محفل جمی تھی موصوف خوب ترنگ
میں آکر بڑی چھبتے دار باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت کی پرلطف
کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ البتہ
جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ مجھے خوب یاد ہے چنانچہ باتوں
باتوں میں جب قانون کے ذریعہ اصلاح معاشرت کا ذکر آیا
تو کہنے لگے:-

"تم لوگوں کے نئے اصول و قوانین نہ جانے میں پشت چھپے

معلوم ہوتے ہیں اور کاغذ پر بڑے بھلے لگتے ہیں مگر حقیقت میں ان کی کیا درگت بنائی جاتی ہے اس کا علم صرف چند واقف کاروں ہی کو ہو سکتا ہے۔ پرانے زمانے کی پنچایت اور نئے زمانہ کے الیکشن کا مقابلہ کر کے دیکھو تو خلوص اور دکھاوے کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ ضابطے کی تکمیل کے ساتھ ہر قسم کی بے ضابطگیاں ڈسپلن کی آڑ میں ہڑ بونگ، تعلیم کے پردے میں جہالت، قواعد کی تہ میں من مانا راج، جس قدر ان دنوں ہر جگہ نظر آتا ہے، پرانے زمانے میں کہیں نہیں تھا۔ خیر ان باتوں کو جانے دو۔ اب ایک سچا قصہ سنو۔ تیس پینتیس سال پہلے کا ذکر ہے:

ایک پیر احمق کہ ۷۰ سال کے ضعیف تھے مگر اپنے کو پینتیس سال کا تصور کرتے تھے دولت کے زور پر شادی پر شادی کرتے جا رہے تھے جب انہیں نئی نویلی کا فراق بے چین کرنے لگتا تھا تو اپنی ادھیڑ ہونے والی سابقہ "جہیتی" کو طلاق دے کر عالم برزخ پہنچا دیتے تھے اور ان ہی ہتکنڈوں کی بدولت ہمیشہ شرعی جوکڑا رکھ سکتے تھے۔ نویں مرتبہ جب شادی کرنے بیٹھے تو ایسی ترکیب کی کہ بغیر بر دکھائی نسبت ہو سکے۔ بات پکی ہوئی اور برات لڑکی کے گھر پہنچی۔ لڑکی والوں نے پوچھا

کہ لڑکا کہاں ہے ؟ مصاحبوں نے ۷۰ سالہ بڈھے کھوسٹ کو پیش کیا اور وہی "ساٹھا پاٹھا" کی پرانی تاویل بھی کی مگر یار لوگوں نے بروقت ایسی مخالفت کی جس کی بدولت لڑکی کے رشتہ داروں میں عقل کی لہر دوڑ گئی اور "جذبہ" کا "زندہ" ہو گیا۔ ہوا یہ کہ لوگوں نے سازش کر کے دولہ میاں کو مسند پر بٹھایا اور ایک سہرہ سنایا جس کی مطبوعہ کاپیاں تقسیم بھی کی گئیں شاعر اپنا سہرہ پڑھ رہا اور لوگ قہقہوں سے اس کی داد دے رہے تھے ، دولہ میاں مسند پر بیٹھے شرم کے مارے آنکھ نہیں اٹھا سک رہے تھے۔ نظم کی تاثیر سے ناداں انکار کرتے ہیں معاشیات کے قدرداں سمجھتے ہیں کہ دنیا میں دھن دولت ہی ایک چیز ہے حالانکہ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اکثر دھن دولت جائداد نقدی سب دھری رہ جاتی ہے اور ارمان پورے نہیں ہونے پاتے چنانچہ اس موقع پر ہی دیکھ لیجئے کہ ادب و شاعری کی وجہ سے دولت کو کیسی زبردست زک ہوئی ہے سہرے تو آپ نے یقیناً بہت سنے ہیں اب یہ نرالا سہرا بھی سنئے جس نے کم سے کم اس موقع پر انسانی ہولناکیوں کو نیچا دکھایا تھا شاعر کو اپنی نظم کی تاثیریت کا اتنا یقین تھا اور اسے اپنے کمال پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے شروع ہی سے یہ فرض کر لیا تھا کہ

اس کی شاعری رنگ لائے بغیر نہیں رہے گی: نظم کا لطف اٹھانے کے لئے یہ تصور کر لیجئے کہ مسند پر ۷۲ سالہ دولہ فروکش ہے اور شرمناک ہوس پرستی میں محو بیٹھا دن دھاڑے خواب دیکھ رہا ہے! اس کے خوشامدی مصاحب حلقہ کئے بیٹھے ہیں۔ مہمان جمع ہیں، شادی کی دھوم میں قاضی کا انتظار ہو رہا ہے۔ اچانک طور پر چند لوگ نمودار ہوتے ہیں کچھ مطبوعہ کاغذ تقسیم کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص مسند کے قریب آکر سہرا سناتا ہے۔ شاعری کے لئے تحسین آمیز اور موضوع نظم کے لئے حقارت آمیز کلموں سے ہر مصرعہ کا استقبال کیا جاتا ہے،

سہرا یہ ہے:-

پکارتی ہے یہ ناتوانی وہ سر سے ڈالیں اُتار سہرا
کہ ضعفِ پیری سے ہو گیا ہے کمر خمیدہ یہ بار سہرا

وظیفہ خواں ہے وہ پیرِ داناں، بندھا ہے دل میں شمار سہرا
یہ حب دنیا کا عالم ہے، ہے صورت جن سوار سہرا

بنی کے مکھڑے پہ درد نداں نثار و دکھلائے کر کے سب
یہ زر کی قدرت کا ہے نمونہ خزاں میں لایا بہار سہرا

تھے گل سے رخسار اس بنے کے جیائے سن سے سمٹ گئے ہیں
کھٹک رہی ہے بنی کے دل میں کہیں نہ دے جائے خار سہرا

یہ بولا رضواں "اجڑ گیا سب ان ہی کے سہروں سے باغ جنت
کہاں سے گل ہائے تازہ لاؤں بناؤں جو بار بار سہرا

جس کرم فرما نے یہ نظم لکھائی ہے ان کا کہنا ہے کہ جس وقت یہ سہرا پڑھا جا رہا تھا ساری بارات شرم کے مارے آنکھیں نیچی کئے بیٹھی تھی۔ حد وانتہا یہ کہ خوشامدی مصاحبوں کی بھی مجال نہ تھی کہ کچھ کہتے! قہقہوں نے انہیں خاموش کر دیا تھا حقارت آمیز تمسخر کی وجہ سے خود ان کے اوسان جاتے رہے تھے۔ جب سہرا ختم ہوا تو دولہ کے ہونے والے سسرال والوں نے کہا "جو ہوا سو ہوا، ہم اب نہیں چاہتے کہ ہماری لڑکی زندہ درگور کی جائے۔"

انہوں نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا، دولہ میاں کو بے رنگ واپس ہونا پڑا۔ اس طرح ایک مرتبہ اور دولت کے برتے پر گھمنڈ کرنے والوں اور زر کے مغرور پجاریوں کا سر نیچا ہوا۔ ایک مرتبہ اور سماج نے دولت کو ٹھکرایا! ایک مرتبہ اور شاعری نے ساحری کی اور اپنی تاثیریت اور افادیت کا ثبوت دیا۔

ہمارے "اعداد"

چند دنوں کے لئے وسط ہند کے ایک ترقی پذیر شہر میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ مردم شماری ہو رہی تھی۔ جن صاحب کے پاس میں مہمان تھا ان کے گھر والوں کا نام نشان درج کرنے کے لئے شمار کنندہ صاحب تشریف لائے۔ ہم جس ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے وہیں ان کو بلا لیا گیا اور صاحب خانہ نے گھر کے مردوں اور عورتوں، لڑکوں اور بچوں کے نام وغیرہ لکھانے شروع کئے تاکہ "یہ کام بھی جلد نبٹ جائے اور جو باتیں مجھے معلوم نہیں وہی متعلقہ افراد سے دریافت کر لی جائیں اور کام تکمیل پا جائے"۔ کچھ وقت گذاری کی خاطر اور کچھ کھوج پن سے مغلوب ہو کر میں نے بھی دیکھنا شروع کیا کہ شمار کنندہ صاحب کر کیا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ مردم شماری کے تختے کے جس خانے میں انہوں نے ایک عورت کے زندہ بچوں کی تعداد اور جس خانے میں مرے ہوئے بچوں کی تعداد لکھی تھی، دوسری عورت کے بچوں کی کیفیت لکھتا رہا بالکل الٹا عمل کیا اور زندوں کے خانوں میں مُردوں کی کیفیت اور مُردوں کے خانے میں زندوں کی تعداد درج کر دی۔ میں نے انہیں ٹوکا

تو وہ کسی قدر بے زاری سے کہنے لگے!

"صاحب! ہم اپنا کام بخوبی جانتے ہیں!"

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر صاحب خانہ کر تیوری بتا رہے تھے کہ وہ اس مداخلت کو طوالت کا باعث سمجھ رہے ہیں، لہٰذا خاموش ہو گیا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کہ صاحب خانہ نے واقف زبانوں میں ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں بلکہ چار زبانیں لکھا ڈالیں! میں نے بعد میں ان سے زبانوں کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگے۔

"اردو اور انگریزی، فارسی اور عربی!"

اور شاید میرے شک کا قیاس کر کے کہنے لگے:

"شکر ہے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمان فارسی اور عربی سے غافل نہیں اور اردو کے ساتھ اپنی مقدس زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں"

اردو کو مسلمانوں سے تخصیص کرنے کے علاوہ فارسی کو بھی مسلمانوں کی مقدس زبان سے تعبیر کیا جاتا معلوم کرنے کے بعد میری ہمت کیوں کر ہو سکتی تھی کہ اس موضوع پر گفتگو کر سکتا میں نے کوئی اور بات چھیڑ دی۔ بعد میں میرے میزبان ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ پڑوس میں کوئی زمیندار صاحب رہتے ہیں جنہوں نے واقف زبانوں میں ۱۱ کا حوالہ دیا ہے، اردو، فارسی، عربی

ہندی، مرہٹی، گجراتی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی!
حالانکہ انہیں انگریزی بھی یوں ہی سی آتی ہے اور اردو لکھنے
پڑھنے میں بھی معمولی استعداد ہے۔ میں نے دریافت کیا
آخر انہیں ہمت کیسے ہوئی کہ انہوں نے اتنی ساری زبانوں
کی واقفیت کا دعویٰ کر دیا تو معلوم ہوا کہ گذشتہ جنگ عظیم کے
بعد زمیندار صاحب نے زیارت اور تفریح کی خاطر اسلامی
اور یورپی ممالک کا دورہ کیا تھا۔ چند دن ترکی میں کچھ دن
اطالیہ میں اُسی قدر فرانس اور جرمنی میں رہ کر چند مہینے
انگلستان میں قیام کیا تھا اور ایک سال کے اندر ہی اپنے
وطن واپس آ گئے تھے آخر جرمنی کے قیام میں اُنہوں نے!

WIE GEHT ES IHNEN?

وغیرہ سنا ہی ہوگا AUF WIEDERSEHEN! کہنا بھی
شاید سیکھ لیا ہوا اور کسی کی یاد کے ساتھ یاد رہ گیا ہو! اس
پر بھی وہ اپنی جرمن دانی چھپاتے تو گویا بے موقع انکساری
کرتے۔ کچھ نہیں تو چند لوگوں کو ہی معلوم ہو جائے گا کہ جاہل
ہندستان کے گھور اندھیرے میں علم اور ادب کے کیسے
کیسے منور جواہر پائے جاتے ہیں۔ نہ جانے جھوٹی شیخی اور
مغالطہ پرور مذہب زدگی کی وجہ سے زبان دانوں کی تعداد کی
نوعیت کیا سے کیا ہو گئی ہے۔

بات سے بات پیدا ہوتی ہے! چند سال پیشتر کا ذکر ہے کہ آبادی کے مسئلہ پر کچھ کام کر رہا تھا۔ ایک دیسی ریاست کی مردم شماری کی روئداد میں لکھا تھا کہ ریاست میں آکر بس جانے والوں اور عارضی طور پر قیام کرنے والوں کی جتنی تعداد تھی تقریباً اتنی ہی تعداد ریاست کے باہر جاکر صوبوں اور ریاستوں میں بس جانے والوں کی تھی۔ گویا علمی اصطلاحوں میں خارجی اور داخلی توطن برابر تھا زیر بحث وہاں میں جتنے بچے پیدا ہوئے تھے، اس سے زیادہ مرنے والوں کی تعداد تھی! دراصل عبرت کی بات تو یہی ہے!! پھر بھی اضافہ آبادی ۹ ء ۱۰ فی صد بتایا گیا تھا!! اس صریحی غلطی کی طرف میں نے متعلقہ محکمہ کی توجہ دلائی تو کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک کانفرنس کے سلسلے میں اس ریاست کی راجدھانی جانے کا موقع ملا فرض غرض سے محکمہ اعداد و شمار کے افسر سے میں نے اپنا تعارف کروایا، جان پہچان بڑھائی، دوستی گانٹھی اور وقت مقرر کرکے ان کے دفتر میں آن دھمکا اور اپنی کھوج جاری کی۔ معلوم ہوا کہ زیر بحث روئداد میں جن ولادتوں کی تعداد ہے وہ مردم شماری کے موقع پر ہر عورت سے فرداً فرداً دریافت کرکے جمع کر لینے سے حاصل ہوئی ہے افسروں سے براہ راست استفسار کرنا تو بہر حال

ناممکن ہے)مرنے والوں کی تعداد محکمہ صفائی اور کوتوالی
اور پولس اور صحت عامہ کے فراہم کردہ اعداد کی میزان ہے!
محکمے کے افسر پنشن قریب بزرگ تھے جو عالم بالا اور حکام
ریاست سے حاصل شدہ توسیع کی وجہ سے بقید حیات
اور برسر عہدہ تھے! میں نے عرض کیا "پھر بھی یہ تو نہیں
ہونا چاہیئے تھا کہ پیدائشوں کی تعداد کم، موتیں زیادہ، تو لمن
برابر اور آبادی میں اضافہ بتایا جائے" تو جواب ملا،

"اول تو وہ روئداد میرے مددگار صاحب کی
مرتب کی ہوئی ہے دوسرے یہ کہ پوری روئداد
اس قدر چھان بین کے ساتھ پڑھتا ہی کون ہے!"
میرے کچھ کہنے سے قبل انہوں نے بڑے مشفقانہ
انداز میں بیان کیا:

"میاں! ہم اپنی مردم شماری کی روئداد اس وقت
شائع کرتے ہیں جب کہ قرب و جوار کے بعض
صوبوں اور علاقوں کی روئدادیں شائع ہوجائیں
ہم نے دیکھا کہ فلاں صوبے میں ۱۲½ فی صد
فلاں صوبے میں ۱۰ فی صد، فلاں انگریزی
علاقے میں [illegible] ریاست میں ۱۱ فی صد آبادی بڑھی
تھی تو ہم نے بھی [illegible] ۹ [illegible] خیال کیے

بغیر ۱۱ فی صد اضافۂ آبادی قرار دے دیا۔ خدا بھلا کرے میرے مرحوم دوست کا؛ وہ میرے بڑے سچے بہی خواہ تھے کہ اُنہوں نے ۱۱ فی صد کی بجائے ۹ ، ۱۰ فی صدی کر دیا! سیجیے میری حفاظت کے لیے اور زور نمودار ہوا۔ اعشاریوں کو کتنے لوگ سمجھتے ہیں؟ لوگ کیا معنی؛ پڑھے لکھے، میٹرک پاس، بی اے اور سرکاری عہدہ دار!! مغالطہ ہو تو امتحان کرلو۔

میں اس جہاں دیدہ، زمانہ شناس کی باتیں غور سے سنتا ہوا خاموش بیٹھا تھا وہ تھوڑی دیر رک کر بے تکلفانہ لہجے میں کہنے لگے:

"سرکار انگلشیہ کے تمام علاقوں میں گیارہ بارہ فی صد اضافہ ہوا اور ہم محض نجی طور پر فراہم کردہ اعداد سے آبادی کی کمی ظاہر کر دیں تو یقین مانئے سارے ہندستان میں اس ریاست کے خلاف پروپگنڈہ شروع ہو جائے!! اس کے ساتھ ہی میری نوکری برخاست ہو جائے بلکہ پنشن کے لالے پڑ جائیں! باہر کے لالچی اخبار، تاوان کے آرزومند لیڈر اور اس ریاست کے بھی بعض غدار افراد مل کر شور مچانے

لگیں کہ نہ جانے یہاں کون کون سی وبائیں پھیلتی ہیں کہ آبادی گھٹ رہی ہے!

ان خود اعترافی انکشافوں کو سنتا ہوا میں ششدر بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہ کر انہوں نے فاتحانہ انداز میں کہا:

"بھائی! یہ پروفیسری نہیں، حکومت ہے!"

اور آخر میں اُنہوں نے جو بات پوچھی وہ میں بھُلائے نہیں بھول سکتا:

"تمہیں کچھ کام نہیں ہے کہ روندادیں پڑھتے رہتے ہو اور —— بیکار مقابلہ کرتے رہتے ہو!"

نہ معلوم میں وہاں سے کیوں کر رخصت ہوا اور کیا کہہ کر اپنی جان چھڑائی، البتہ بعد کے تجربے سے مجھے اچھی طرح معلوم ہوا کہ اعشاریوں کے سمجھنے کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل سچ ہے۔ "عقل مند کے لئے اشارہ کافی ہے"، مگر جو لوگ اشاروں کو بھی نہیں سمجھ سکتے وہ اعشاریوں کو کیا سمجھیں گے!

طنزیہ لطیفہ

جن لوگوں کو بلہارشاہ لائن سے ناگپور جانے کا اتفاق ہوا ہے انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ وردھا جنکشن سے جب گاڑی آگے بڑھتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم واپس جارہے ہیں۔ اسی طرح ناگپور سے حیدرآباد آنے والوں کو بھی وردھا سے چلتے وقت یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ وہ پھر اُلٹے جارہے ہیں (وردھا سے ہی ایسا مقام جہاں لوگوں کو خواہ مخواہ غلط فہمی ہوتی ہے!) بات یہ ہے کہ ریل کی پٹڑی ایک تکونیہ (زاویہ) کی شکل میں بنی ہے اور وردھا اس تکونیے کے انتہائی پچھمی نقطے پر واقع ہے۔ لہذا وردھا سے چلتے وقت حقیقت میں کچھ فاصلے تک گاڑی اسی سمت واپس آکر جنوب کے جانب مڑتی ہے۔

ناگپور

وردھا

ظاہر ہے جنوب سے ناگپور جاتے وقت اس کے برعکس

عمل ہوتا ہے۔ اب لطیفہ سُنئے جب ہم دہلی سے واپس آرہے تھے، حیدرآباد کے ڈبے میں اکثر سرکاری عہدہ دار اور ملازم تھے۔ ہمارے کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ دو ٹھیٹ ملکی اور دو ٹھیٹ غیر ملکی (پنجابی) اصحاب تھے۔ پڑوسی ڈبوں سے بھی یار لوگ پہنچ جاتے تھے اور ہمارے ڈبے میں گپ بازی ہوتی تھی۔ ایک آتا تھا ایک جاتا تھا، غرض ڈبے کا ہمارا حصہ سب کے لئے اڈا بنا رہا اور گھنٹوں گفتگو کا سلسلہ رہا۔ مختلف بحثوں کے دوران میں "ق" کی کثرت استعمال یا قلت استعمال سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ سالہا سال کی تعلیم وتدریس کے باوجود ہمیں مادری زبان پر کس قدر عبور حاصل ہوتا ہے! اس پر طرہ یہ کہ کوئی "ق" کی بجائے "غ" اور "خ" کی بجائے "ق" کہہ رہا ہے تو دوسرا ق اور ک میں کسی قسم کے امتیاز کا قائل ہی نہیں۔ "تخلیک" کہنے والوں سے تو ہم بخوبی واقف ہیں۔ حیدرآباد میں خ اور ق دونوں بولے جاتے ہیں مگر انہیں اکثر بدل دیا جاتا ہے مثلاً "اقبار وخت"۔

تیسرے پہر ملکیوں اور غیر ملکیوں میں اردو دانی کے علاوہ تنظیمی قابلیت اور حکومتی صلاحیت کے متعلق خوب گرما گرم اور کسی قدر تلخ لہجے میں بحث ہوئی۔ ایک دکنی نے یہاں تک کہہ دیا۔

"اجی تاں صاب! آپ ہمیں خرابی کا بکرا بنانا چاہتے ہیں۔ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔"

بات گئی گذری! تھوڑی دیر کے بعد وردھا آیا سب کے سب پلیٹ فارم پر ٹہلتے رہے اور ٹھنڈی ہوا کھا کر ڈبے میں آ بیٹھے جوں ہی گاڑی چلی ایک ملکی نے کہا:

"ارے! اپن تو الٹے جا رہے ہیں۔"

تڑ سے جواب ملا! مانو کسی نے بھالا مارا:

"اب دکن ہو آ گئے!!"

حیدرآباد بک ڈپو

روبرو اسٹیٹ بنک حیدرآباد۔ دکن

حیدرآباد بک ڈپو بلدۂ حیدرآباد میں معیاری، علمی اور ادبی کتابوں کا سب سے قدیم مرکز ہے جو انگریزی اور اردو کی علمی اور ادبی کتابیں فراہم کرتا ہے۔

ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن اور ادارۂ ادب جدید و نیز ہندوستان کے دیگر اداروں کی جملہ تصنیفات و تالیفات حیدرآباد بک ڈپو سے طلب فرمائیے۔

حیدرآباد بک ڈپو کی چند کتابیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں

"چاند بی بی" مصنفہ خدیجہ بیگم صدر معلمہ ماڈل پرائمری اسکول یہ مختصر ڈرامہ ہے جو بچوں کے لئے نہایت مفید ہے۔

قیمت ۸ر

"مضامین عظمت" حصہ دوم قیمت عا

"نراس" مولوی نورالحسن صاحب کی مقبول عام تصنیف دلچسپ افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ

"منتخبات ہندی کلام" مصنفہ ڈاکٹر جعفر حسن میٹھے، رسیلے اور دل میں اتر جانے والے ہندی دوہوں کا انتخاب۔ قیمت (عہر)

"علیگیات" مولوی غلام پنجتن صاحب شمشاد کی تصنیف گھر بیٹھے قدیم علیگڑھ کی سیر دوستوں اور عزیزوں کی چلتی پھرتی تصویریں۔ قیمت (عا)

تاریخ حُسن کاری

"تاریخ حُسن کاری" مولوی امجد علی صاحب کی تصنیف ہے جس کاوش، محنت اور سلیقہ سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کی داد اہل نظر ہی دے سکتے ہیں۔ قابل مصنف نے کوزہ میں دریا بھرا ہے۔ مختلف ملکوں کی نقش کاری کی تاریخ مختصر لیکن واضح طور پر اس طرح بیان کرنا کہ عامی کے بھی سمجھ میں آجائے کوئی معمولی بات نہیں۔ حیدرآباد بک ڈپو لائق مصنف سے اس زنجیر کی دوسری کڑیاں بھی تکمیل کرانے والی ہے تاکہ عوام کو حُسن کاری کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہوجائے۔

فنی کتاب ہونے کے باوجود قیمت صرف ڈھائی روپیہ اس واسطے رکھی گئی ہے کہ ہر شخص اس انمول کتاب سے جو اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے مستفید ہوسکے۔

ملنے کا پتہ

حیدرآباد بک ڈپو

حیدرآباد اسٹیٹ بنک کے قریب

حیدرآباد۔ دکن

حیدرآباد بک ڈپو

کی

بالکل نئی کتاب

نراس نورالحسن صاحب کے لکھے ہوئے مختصر افسانوں کا مجموعہ. دلچسپ پلاٹ کو ٹکسالی زبان میں پیش کرنا نورالحسن صاحب کے معاشرتی قصوں اور کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے.

قیمت ۱۲/

پتہ

حیدرآباد بک ڈپو

حیدرآباد اسٹیٹ بنک کے قریب

حیدرآباد دکن

Subject ...... سلیس اردو

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یہ نئی کتاب بہت موزوں ہے۔ اس میں سات معلوماتی مضمون، تین نئی سماجی کہانیاں اور متعدد رباعیاں، غزلیں اور نظمیں ہیں عام ڈگر سے ہٹ کر اس انتخاب میں ان نظموں کو بھی جگہ دی گئی ہے جو ٹھیٹ دکنی زبان میں لکھی گئی ہیں۔

ہر شاعر کے متعلق مختصر تشریحی اور تنقیدی نوٹ بجائے خود قابل قدر اور کہیں کہیں بہت دلچسپ اور فکرانگیز ہے۔

لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ اچھا

۲۲۴ صفحے قیمت ۱۲ ر